بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

انتخابات کسی سنجیدہ، باشعور اور تعمیری مقاصد رکھنے والی قوم کے لیے ایک اہم اجتماعی فریضہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے انعقاد کی غرض یہ ہوتی ہے کہ عوام کو یہ حق دیا جائے کہ وہ آزادی سے اپنی مرضی کے مطابق اپنے لیے ایسے حکمراں چُن لیں جو نہ صرف اُن کے جان و مال، عزت و آبرو کی بخوبی حفاظت کرسکیں بلکہ اُن کی اجتماعی اُمنگوں کو بطریقِ احسن پروان چڑھا سکیں جنھیں وہ پیکرِ محسوس میں ڈھالنے کے شدید آرزومند ہوتے ہیں۔

ووٹ کے ذریعہ حکومت کرنے والے ہاتھوں کی تبدیلی انسانیت کا ایک بیش قیمت تجربہ ہے جس نے انسانیت کو اُس کرب و بلا سے بچایا ہے جس میں قومیں ناپسندیدہ فرمانرواؤں کی تبدیلی کے وقت برابر مبتلا ہوتی رہی ہیں۔ لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ انتخابات بالکل منصفانہ ہوں تاکہ حکمرانوں کے معاملے میں عوام کو اپنی مرضی بروئے کار لانے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔ انتخابات کا یہ عمل جس قدر آزادانہ ہوگا اُسی نسبت سے قوم کی سیاسی تربیت ہوگی اور اُس میں نیک و بد کی تمیز اور صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔

اس کے برعکس اگر انتخابات کے اعلانات تو بڑے کرّوفر سے کیے جائیں اور ملک کا حکمران طبقہ انھیں اپنی جمہوریت نوازی کے ثبوت میں بطور روشن دلیل پیش کرے مگر اس کے لیے وہ آزاد فضا مہیا نہ ہونے دے جس میں لوگ جبر و اکراہ کے بغیر کھل کر اپنی رائے کا اظہار کرسکیں تو انتخابات کی ساری

کارروائیاں محض ڈھونگ بن کر رہ جاتی ہیں جس سے ملک اور قوم کو شدید نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ انتخاب اگر کسی قوم کے لیے سنجیدہ معاملہ نہ رہے بلکہ محض ڈھونگ کی حیثیت اختیار کر لے تو اس سے عالمی برادری میں اس قوم کی ساکھ گر جاتی ہے۔ چنانچہ جن آمرانہ حکومتوں کے تحت انتخابات کا ناٹک رچا کر ایک خاص گروہ کو مسندِ اقتدار پر چپکا دیا جاتا ہے وہاں نہ تو جمہوری اداروں کو استحکام نصیب ہوتا ہے اور نہ بیرون ملک کوئی شخص ان کی جمہوریت پسندی پر یقین کر کے ان کا احترام کرتا ہے۔ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک یہی تاثر قائم ہوتا ہے کہ برسراقتدار طبقہ حکومت تو دھونس اور دھاندلی کے ذریعہ کرنا چاہتا ہے لیکن لوگوں کو فریب دینے کی غرض سے انتخابات کا تماشہ دکھا رہا ہے۔ پھر اس طبقہ کے بارے میں لوگوں کو اس امر کا یقین ہوتا ہے کہ یہ عوام میں اپنی مقبولیت اور وقار کھو چکا ہے اس لیے اسے یہ خوف لاحق ہے کہ اگر عوام کو اظہار رائے کی آزادی دی گئی تو وہ لازمی طور پر اس کے خلاف ہی فیصلہ دیں گے۔ اس وجہ سے وہ ووٹ کے صحیح استعمال میں مزاحم ہوتا ہے۔ انتخابات کے معاملے میں کسی گروہ کی دھاندلی اس کے احساسِ شکست کی علامت ہوتی ہے۔ اس سے ملک میں حکمران طبقے کے خلاف شدید نفرت پھیل جاتی ہے۔ واقعات اس امر کے شاہد ہیں کہ جن حکمرانوں نے ناجائز ہتھکنڈوں کی مدد سے انتخابات جیتنے کی کوشش کی یا اپنی بداعمالیوں کے پیش نظر اس قومی احتساب سے خوف زدہ ہو کر اسے ٹالنے پر زور دیا انہیں جلد ہی عوامی غیظ و غضب کا نشانہ بن کر مسندِ اقتدار سے محروم ہونا پڑا۔

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے پہلے متحدہ ہندوستان میں جس طرح کے انتخابات منعقد ہوتے رہے اور انگریز نوکر شاہی کے ذریعے اپنی پسند کے جاگیرداروں کو مسندِ اقتدار پر براجمان کرنے کے لیے جو چالیں چلتا رہا اُن سے پوری دنیا واقف ہے۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ غیر ملکی سامراج اپنے ناجائز مفادات کے تحفظ کے لیے اس طرح کی غیر اخلاقی کارروائیاں کرنے پر مجبور تھا۔ لیکن ہم اسے پاکستان کا سب سے بڑا المیہ سمجھتے ہیں کہ آزادی کا سورج طلوع ہونے کے بعد بھی یہاں کے عوام کو اس بات کا اختیار حاصل نہیں کہ وہ حکومت کے ایوانوں میں اپنی پسند کے نمائندے بھیج سکیں۔

مرحوم لیاقت علی خان جن پر منصفانہ انتخابات منعقد کرانے کی سب سے بڑی ذمہ داری عائد ہوتی تھی ان سے اس باب میں کوتاہی سرزد ہوئی۔ اگر وہ ایک دو مرتبہ پوری خود اعتمادی اور عزم سے کام لیتے ہوئے اس میدان میں نہایت اچھی روایات قائم کر دیتے تو پھر جمہوریت کو صحیح خطوط پہ نشوونما پانے کے لیے زبردست سہارا ملتا۔ مگر افسوس وہ بعض مخصوص مصلحتوں کے تحت یہ کام سرانجام نہ دے سکے جس سے ملک میں جمہوریت کی مٹی پلید ہونا شروع ہوئی۔

نواب زادہ لیاقت علی کے بعد یہاں جو شخص بھی مسندِ اقتدار پہ فائز ہوا، اس نے سازشوں کی مدد سے یہ مرتبہ حاصل کیا۔ ملک غلام محمد سیاسی گٹھ جوڑ کے نتیجے میں ملک کے سیاہ و سپید کا مالک بنا۔ اس نے جمہوری اصولوں کو اپنے پاؤں تلے روند کر عوام کی گردنوں پہ مسلط رہنے کی کوشش کی اور مختلف حیلوں، بہانوں سے بلکہ چیرہ دستیوں سے کام لے کر ان انتخابات کو التوا میں ڈالا اور کسی اخلاقی، قانونی اور آئینی جواز کے بغیر محض اقتدار کے نشہ میں بدمست ہو کر دستور ساز اسمبلی کو توڑ ڈالا۔ اس بے بصیرت شخص نے صرف اپنی طاقت کے زعم میں اس سنگین اقدام کے نتائج سوچے بغیر یہ سب کچھ اس غلط مفروضہ کی بنا پہ کر ڈالا کہ اس سے اُس کا دورِ اقتدار طویل ہوگا اور یہ انتہائی غیر دانشمندانہ قدم اُٹھاتے ہوئے اُس نے ان خرابیوں پر غور کرنا گوارا نہ کیا جنہیں اس قسم کے مجنونانہ اقدام بالعموم جنم دیتے ہیں۔ اس شخص کے برسرِ اقتدار آنے سے پیشتر بھی ملک کی سیاسی فضا آمرانہ رجحانات سے کسی حد تک مکدّر تھی، لیکن اس کے جمہوریت کُش عمل کی وجہ سے اس فضا پہ تیرگی کے مہیب بادل چھاگئے جن کی آستینوں سے پیہم ایسی بجلیاں گرتی رہیں جنہوں نے عوام کے تصورِ آزادی اور ان کے انسانی حقوق کو بالکل غارت کر کے رکھ دیا۔

اس بگڑے ہوئے مزاج کے آمر نے ملک کے ڈیفنس سیکرٹری اور فوج کے سربراہ اور پولیس کے اعلیٰ افسران اور دوسری نوکر شاہی کی مدد سے جو چاہا ہر قسم کے احتساب سے بے نیاز ہو کر کیا جس سے ملک بڑی سرعت کے ساتھ تباہی و بربادی کی طرف بڑھنے لگا، لیکن اس نے اپنی غلط بخشیوں کی مدد سے خوشامدیوں اور ضمیر فروشوں کا ایسا مضبوط ٹولہ تیار کر لیا جو اُس کے ہر قول و فعل پر، خواہ وہ دینی اور قومی نقطۂ نظر سے کتنا ہی ناپسندیدہ ہوتا تعریف و توصیف کے ڈونگرے برسانے پہ تیار رہتا۔ یہی وہ ٹولہ تھا جس نے دستور ساز اسمبلی توڑنے جیسے گھناؤنے جرم پہ اُسے نجات دہندہ

کہہ کر اُس کی مدح و ستائش کی۔ چنانچہ ملک صاحب کی اس عاقبت نا اندیشانہ روش نے ملک میں یہ غلط روایات قائم کیں کہ سب سے پہلے جائز و ناجائز ہتھکنڈوں کے ذریعے عنانِ اقتدار اپنے ہاتھوں میں لینے کی کوشش کی جائے اور پھر اقتدار کی قوت سے ملک میں ایسی فضا قائم کی جائے جس میں مخالفت کی ہر آواز دب کر رہ جائے۔ اور اگر کوئی آواز اُٹھے تو صرف مدح و ستائش کی آواز ہو۔

جس طرح بُرائی بدی کے بطن سے جنم لیتی ہے اور بدی ہی کو معرضِ وجود میں لاتی ہے اسی طرح آمریت سیاسی گھٹن کی کوکھ سے نمودار ہوتی ہے اور سیاسی استبداد کا سلسلہ دراز کرتی ہے۔ چنانچہ ملک صاحب جیسے آمر کا تسلّط ختم کرنے کے لیے ایک ایسا شخص آگے بڑھا جسے اپنے عہدہ کی بنا پر فوج میں اچھا خاصا اثر و رسوخ حاصل تھا اور اپنی اس مضبوط پوزیشن کی وجہ سے محلاتی سازشوں میں نہایت مؤثر کردار ادا کر رہا تھا۔ اس نے ہمت اور جرأت کر کے اس مفلوج شخص سے اقتدار تو چھین لیا مگر اُسے اُن عوام کی طرف لوٹانے کے بجائے جنھیں اللہ تعالیٰ نے اس کا امین ٹھیرایا تھا خود اس پر بلا شرکتِ غیرے قبضہ جما کر بیٹھ گیا۔ اور عام آبادی کو اس کے انسانی اور جمہوری حقوق سے اس طرح محروم رکھنے کی کوشش کی جس طرح اس کے پیشرو کے عہدِ حکومت میں رکھا گیا تھا۔ چنانچہ عوام بیچارے کالانعام ہی رہے اور انھیں انسان سمجھ کر ان سے کوئی عزت و احترام کا معاملہ نہ کیا گیا۔ آمر چونکہ سازش کی پیداوار ہوتا ہے اس لیے عوامی تائید کی نہ تو وہ کوئی ضرورت محسوس کرتا ہے اور نہ اُسے اِس کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ اسے ہمیشہ اس بات کی فکر دامن گیر رہتی ہے کہ نوکر شاہی کے اندر قوت و طاقت کے سارے مراکز پر صرف اسی کا قبضہ رہے تاکہ وہ اُن کی مدد سے مخالفین کو ٹھکانے لگا سکے۔ چنانچہ وقت کا یہ آمر سرکاری مشینری کے چند اُونچے عہدہ داروں کے ہاتھوں میں کھیلتا ہے اور اسی طرزِ عمل کو اپنے حق میں مفید خیال کرتا ہے اور نوکر شاہی کے مضبوط حصار کی پناہ لے کر عوام پر تابڑ توڑ حملے کر کے ان کی اجتماعیت کا شیرازہ بکھیرنے اور ان کی قوت توڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ سکندر مرزا نے پاکستانی فوج کے سربراہ فیلڈ مارشل محمد ایوب اور حکومت کی مشینری کے چند دوسرے کل پرزوں کی مدد سے ہر وہ کام کیا جس سے ملک پر اس کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہو اور مخالفت کا کوئی خفیف سے خفیف جھونکا بھی اِس کی مسندِ اقتدار

کو چھوتے نہ پائے لیکن افسوس اِن ساری حفاظتی تدابیر کے باوجود اُسے اُن لوگوں کی سازشوں کی وجہ سے بہت بے آبرو ہوکر تختِ اقتدار سے الگ ہونا پڑا جنہیں وہ اپنی دانست میں اپنے لیے مضبوط پناہ گاہ سمجھ رہا تھا ۔ جس شخص کی قوت کے بل بوتے پر سکندر مرزا ایک آمرِ مطلق بنا بیٹھا تھا ، اُس کے ذہن میں قدرتی طور پر یہ خیال پیدا ہوا کہ جب وہ کسی دوسرے فرد کو تخت نشین کرانے کی قوت رکھتا ہے تو وہ اُسے وہاں سے ہٹا کر خود اس پر براجمان کیوں نہیں ہوسکتا ۔ اسی زعم میں گرفتار ہوکر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے دستور کو کالعدم قرار دے کر پورے مُلک میں مارشل لا نافذ کیا اور اس طرح ملک کو بے آئین کر دیا اور پھر محض فوج کی قوت سے عوام پر مسلّط ہوکر من مانی کارروائیاں کرنے لگا ۔ اقتدار کی حد سے بڑھی ہوئی ہوس نے اُس کی سوچ کو اس قدر مفلوج کر دیا تھا کہ اُسے قطعاً یہ بات سُجھائی نہ دی کہ وہ جو اقدام کر رہا ہے وہ اُس حلف کی خلاف ورزی ہے جسے اُٹھا کر وہ ایک دستور کے تحت ملک کی مسلح افواج کا سربراہ بنا ہے ، اس لیے اُس کا یہ فعل صریح بغاوت کا مترادف ہے ۔ اُس فوجی سربراہ نے مارشل لا نافذ کرکے عوام میں زبردست خوف وہراس پھیلا دیا ۔ اِن حوصلہ شکن حالات میں بھی چند باضمیر انسانوں نے نہ صرف اس کی اس غیر قانونی جسارت پر شدید احتجاج کیا ، بلکہ اس صریح ناانصافی پر مُلک کی سب سے اُونچی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر صد افسوس جج صاحب نے وقتی مصالح کی آڑ میں ایسا فیصلہ صادر کر دیا جس سے اس باغیانہ کارروائی کو سندِ جواز حاصل ہوگئی ۔

فوجی حکمران اور عوام میں دس برس تک کشمکش جاری رہی ۔ فوجی ڈکٹیٹر اس انداز سے نظامِ مملکت چلاتے پر زور دیتے رہے گویا قوت کا منبع اور طاقت کا سرچشمہ ان کی ذاتِ گرامی ہے ، اور وہ جو کہہ دیں وہی مُلک کا آئین ہے اور جو وہ کر دیں وہی دستوری روایات ہیں ۔ دوسری طرف عوام اُن کی اِن آمرانہ کارروائیوں کو اپنے حقوق کی پامالی سمجھ کر انہیں مختلف طریقوں سے روکنے کی کوشش کرتے رہے ۔ اس کشمکش نے جو مارشل لا کے نفاذ کے روزِ اوّل ہی سے شروع ہوچکی تھی ، آہستہ آہستہ زور پکڑا اور حکمران صاحب عوامی دباؤ کے تحت مُلک کو آئین دینے پر مجبور ہوگئے ۔ لیکن چونکہ وہ دستور عوامی آرزوؤں کا ترجمان نہ تھا بلکہ ایک آمر کے غیر محدود اختیارات کو تحفظ

دینے والا تھا، اس لیے عوام اُس سے کسی طرح بھی مطمئن نہ ہو سکے، اور حکمران کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات میں مسلسل شدّت پیدا ہوتی رہی، جس نے فیلڈ مارشل کو یہ حقیقت تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ رائے عامہ کے علی الرّغم محض انتظامیہ کی قوت کے بل بوتے پر لوگوں کی گردنوں پر زیادہ دیر تک مسلط رہنا کسی طرح بھی ممکن نہیں، اور جبر و تشدّد کا یہ عمل قوم، ملک اور خود اُن کے حق میں کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس حقیقت کے ادراک کے بعد وہ عوام کو ان کے چھنے ہوئے حقوق واپس کرنے پر آمادہ ہی تھے کہ ایک دو عاقبت نا اندیش سیاسی طالع آزماؤں کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے بحالیٔ جمہوریت کی یہ کشتی ساحلِ مراد پر پہنچنے کے بجائے مارشل لاء کی ایک دوسری خوفناک لہر کی نذر ہو کر رہ گئی، اور قوم نے دس سال کی جدّوجہد کے بعد اپنے آپ کو بے بسی اور محرومی کے اُسی مقام پر پایا جہاں وہ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں محمد ایوب خان کے مارشل لا کے وقت حیران و ششدر کھڑی تھی۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے مارشل لا کے ذریعہ عنانِ اقتدار فوج کے سربراہ محمد یحییٰ خان کو منتقل کر دی۔ اس شخص نے حالات کے خشمگین تیور دیکھتے ہوئے ملک میں انتخابات منعقد کرانے کا التزام تو کیا لیکن اُن اُمنڈتے ہوئے طوفانوں کی طرف قطعاً توجہ نہ دی جو اُن انتخابات کی افادیت کو برباد کرنے والے تھے۔ مارشل لا کی تیرہ فضا میں صوبہ پرستی کی تحریک نے کافی زور پکڑا اور اس وجہ سے مختلف صوبوں سے تعلق رکھنے والوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت کے جذبات پرورش پانے لگے۔ ملک کے سربراہ نے اس خطرناک صورتِ حال پر غور کیے بغیر وَن یونٹ کو توڑ دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نفرت کے دبے ہوئے جذبات لاوا بن کر پھوٹ پڑے جس نے ملک کی ساری فضا کو مسموم بنا دیا۔ ہیجان کی اس خوفناک کیفیت میں عوام نے انتخابات میں تعمیری انداز پر سوچ کر کوئی فیصلہ کرنے کے بجائے جذباتی نعروں میں بہ کر بعض غلط فیصلے کر دیے، جس کا بعد میں انہیں شدید احساس بھی ہوا۔ یحییٰ صاحب نے بظاہر تو ہر سیاسی جماعت کے لیے یہ بات لازمی قرار دی کہ وہ اپنا منشور اُن کے پیش کردہ دستوری ڈھانچے کے مطابق تیار کرے، لیکن اُس کی پابندی کرانے میں وہ بالکل بے بس رہے، اور بعض سیاسی جماعتوں نے اس سے صریحاً انحراف کرتے ہوئے ایسے

منشور پیش کیے جو پاکستان کے بنیادی تخیل سے مغائرت رکھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قوم محدود اور وقتی مصلحتوں کے زیرِ اثر آ کر انتشار کا شکار ہو گئی۔

اِس سارے عرصہ میں مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو اور سابق مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کا طرزِ عمل ہر لحاظ سے ناپسندیدہ رہا اور اِن دونوں حضرات نے کوئی تعمیری کام سر انجام دینے کے بجائے عوام کے جذبات سے کھیل کر ہر قیمت پر مسندِ اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس معاملہ میں نہ تو اُنہوں نے عوامی خواہشات کا کوئی احترام کیا اور نہ کسی صاحبِ اختیار کی بات کو درخورِ اعتنا سمجھا اور بعض معاملات میں ایسا تعجب انگیز رویّہ اختیار کیا جس کی آج تک کوئی معقول توجیہ پیش نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً اقوامِ متحدہ کے اہم اجلاس میں بھٹو صاحب کا شریک ہونے سے معنی خیز گریز اور ایک فیصلہ کن مرحلے پر جب مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان میں مصالحت کی صورت پیدا ہو رہی تھی ——— پولینڈ کی قرارداد کو چاک کر کے اجلاس سے بطورِ احتجاج واک آوٹ کرنا جبکہ اُس قرارداد کو قبول کرنے کے واضح احکام مل چکے تھے۔ پھر ۱۹۷۰ء کے انتخابات نے پانچ سال کے لیے مسندِ اقتدار کے بارے میں جو فیصلہ کیا تھا اُسے "جمہوریت ہماری سیاست ہے" کا نعرہ بلند کرنے والے اِس سیاستدان نے نہ صرف پائے استحقار سے ٹھکرا دیا، بلکہ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے عوامی نمائندوں کو دھمکیوں کے ذریعے قومی اسمبلی کے اجلاس میں، جو ڈھاکہ میں منعقد ہو رہا تھا، شریک ہونے سے روک دیا۔ اِس کے ساتھ "اُدھر تم اِدھر ہم" کا شوشہ چھوڑ کر اپنے ساتھیوں کو یہ بات سجھائی کہ اُن کے ہاتھ میں عنانِ اقتدار آنے کی واحد صورت یہی ہے کہ ملک دو لخت ہو اور جس خطّے میں اُن کی اکثریت ہے اُس میں وہ مسندِ اقتدار پر قابض ہو جائیں اور مشرقی پاکستان میں رہنے والوں کو اُن کی قسمت پر چھوڑ دیا جائے۔

کیا یہ واقعات کسی انتہائی خود پسند، متکبّر اور آمرانہ مزاج رکھنے والی شخصیت کا پتہ نہیں دیتے؟

تختِ اقتدار پر متمکن ہونے کے بعد بھی اِس حکمران کے آمرانہ طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ کسی قوم کی سیاسی زندگی کا اِس سے بڑا حزنیہ کیا ہو سکتا ہے کہ ایک شخص جمہوریت (باقی بر صفحہ ۴۵)

(بقیہ اشارات)
اور انسانوں کے جمہوری حقوق کی بحالی کا دعویٰ لے کر اُٹھے اور لوگ اُس کے اِس دعوے پر یقین کرتے ہوئے اُس کے گرد جمع ہو جائیں اور اُسے اور اُس کے ساتھیوں کو انتخابات میں کامیاب کرائیں —— لیکن جمہوریت کا یہ پرستار جب اقتدار پر قابض ہو جائے تو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے تمام آمرانہ اختیارات کے ساتھ حکومت کرنے پر مُصر ہو۔ جو لوگ فوجی انقلاب کے ذریعے حکومت پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں وہ بھی اِس امر کے لیے کوشاں رہتے ہیں کہ وہ ایک فوجی آمر کی حیثیت سے مشہور نہ ہوں۔ اِس لیے وہ اپنے آمرانہ اختیارات کو ایک دستور کی صورت دے لیتے ہیں تاکہ اُنہیں ملک کا آئینی سربراہ کہا جاسکے۔ خود ہمارے ملک میں محمد ایوب خاں فوج کے بل بوتے پر اقتدار میں آئے، لیکن انہوں نے ملک کو ایک دستور دے کر جس میں ان کے وسیع اختیارات کا تحفظ تھا، اپنے آپ کو صدر کہلوانا پسند کیا۔

مگر بھٹو صاحب کا معاملہ بالکل جدا تھا۔ اُنہیں انتخابات کے راستے مغربی پاکستان میں ایوانِ اقتدار تک رسائی حاصل ہوئی لیکن جس ذریعے سے اُنہیں آئینی سربراہ بننے کا موقع حاصل ہوا تھا اُس کے بنیادی تقاضوں تک کو نظر انداز کر کے وہ مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بننے پر بضد ہوئے اور اِسی اندھے بہرے قانون کے تحت مملکت کا نظم ونسق چلانے پر زور دیا۔ اُن کا یہ مطالبہ اگرچہ سراسر غیر معقول تھا لیکن حالات کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے حزبِ اختلاف کو اسے ایک مدّت تک کے لیے ناچار تسلیم کرنا پڑا۔

مارشل لاء کے خاتمہ پر ملک کو جو آئین دیا گیا اُسے دیکھتے ہوئے یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ یہ آئین، ایک شخصیت اور اُس کے غیر محدود اختیارات کو سامنے رکھ کر مُرتّب کیا گیا ہے۔ لیکن اِس حقیقت کو پوری طرح جاننے کے باوجود اُسے متفقہ طور پر محض اس لیے قبول کر لیا گیا کہ کسی طرح یہ ملک آمرانہ استبداد سے نجات حاصل کر کے جمہوریت کی راہ پر گامزن ہو جائے۔ پھر اِس کے بعد اُس آئین کا بھٹو صاحب اور اُن کے رفقائے کار نے جس طرح حلیہ بگاڑا ہے اور اُس میں جمہوریت کی جو کمزور سی رُوح موجود تھی اُسے جس ظالمانہ انداز سے آئین کے جسد سے نکالا ہے وہ بڑی ہی کربناک داستان ہے جس نے لوگوں کو خاصا پریشان کر رکھا ہے۔

آمرانہ مزاج اور غیر محدود اختیارات کے ساتھ جب تشدّد پسندانہ رجحانات بھی پرورش

پانے لگیں تو اُن سے عوام پر جو مصائب کے پہاڑ ٹوٹتے ہیں اُن کا ہر شخص بآسانی اندازہ کر سکتا ہے۔
چنانچہ باقی ماندہ نصف پاکستان میں اختلاف کی ہر آواز کو جو شرمناک مظالم ڈھا کر دبا دیا گیا، وہ اگر درندوں کی طرف بھی منسوب کیے جائیں تو وہ بھی ندامت سے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد، خواجہ رفیق اور دیگر متعدد بے گناہ افراد کی زندگیوں کے چراغ محض رائے کے اختلاف کی بنا پر گل کر دیے گئے۔ سینکڑوں افراد کو اِس جُرم بے گناہی کے بدلے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں کہ وہ حاکموں کی ہر بات میں تائید کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ اور جیلوں کے اندر ان کے ساتھ جو حیا سوز سلوک روا رکھا گیا وہ تاریخ کے سیاہ باب کی حیثیت سے ہمیشہ محفوظ رہے گا۔

جمہوری ممالک میں جمہوری اداروں خصوصاً اسمبلیوں اور عدالتوں کا تقدس ہر قیمت پر برقرار رکھا جاتا ہے، لیکن بھٹو صاحب اور اُن کے رفقاء نے اُن کے تقدس کو پامال کرنے سے قطعاً گریز نہیں کیا۔ قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں حزبِ اختلاف سے تعلق رکھنے والے ارکان کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا، اُنہیں غنڈہ عناصر کے ذریعے جبری طور پر ایوانوں سے باہر پھنکوایا گیا، وکلاء پر لاٹھی چارج کروایا گیا اور ملک کے عدالتی نظام میں ایسی "اصلاحات" عمل میں لائی گئیں جن سے ایک طرف تو اُن کے اختیارات کا دائرۂ کار محدود ہو کر رہ گیا اور دوسری طرف اُن کی آزاد حیثیت بہت حد تک متاثر ہوئی۔

پریس کی آزادی جسے کسی ملک میں جمہوریت کے وجود کی سب سے بڑی شہادت سمجھا جاتا ہے، اُس کا جو حشر ہمارے حکمرانوں کے ہاتھوں ہوا ہے اُس سے یہاں کا ہر شخص واقف ہے۔ پاکستان کے قریب قریب سارے اخبارات، (ایک دو مستثنیات کو چھوڑ کر) محض سرکاری خبرنامے بن کر رہ گئے ہیں۔ یہ اخبارات صبح و شام بھٹو صاحب کا سیاسی قد کاٹھ بڑھانے اور اُن سے اختلاف کرنے والوں کی کردار کُشی میں مصروف رہتے ہیں۔

ووٹ نے بھٹو صاحب کو تختِ اقتدار پر فائز کیا لیکن انہوں نے اپنے جارحانہ طرزِ عمل سے سب سے زیادہ اُس کی تذلیل کر کے اُس کی وقعت عوام کی نظروں میں گرانے کی کوشش کی۔ جس پارٹی کے وہ چیئرمین ہیں اُس میں انتخاب کا اُصول ٹھکرا کر ہائی کمان کی طرف سے مختلف عہدوں کے لیے

نازل دگیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ بلدیاتی اداروں میں انتخابات ماضی کی داستان بن کر رہ گئے ہیں اور ضمنی انتخابات میں سرکاری اُمیدواروں کو کامیاب بنانے کے لیے جس دھاندلی کا مظاہرہ کیا گیا اُس نے عوام کا ووٹ پر سے اعتماد بہت حد تک متزلزل کر دیا ہے۔ پھر آزاد کشمیر میں انتخابات کے نتائج اپنے حق میں حاصل کرنے کے لیے جس وسیع پیمانے پر ناانصافی اور ظلم و تشدد سے کام لیا گیا اُس نے موجودہ حکمرانوں کی جمہوریت پسندی کا پردہ پوری طرح چاک کر کے رکھ دیا ہے۔ چنانچہ بھٹو صاحب اور اُن کے ساتھی جب بھی منصفانہ اور آزادانہ انتخابات کی باتیں کرتے ہیں تو عوام یہ سوچنے لگتے ہیں کہ کیا یہ انتخابات اُسی طرز پر "منصفانہ" ہوں گے جن کا مظاہرہ پیپلز پارٹی کی حکومت کے تحت وقتاً فوقتاً ہوتا رہا ہے؟

انتخابات کے بارے میں عوام کے یہ خدشات اور ووٹ کے ذریعے حکمرانوں کی تبدیلی کے متعلق اُن کا احساس بے بسی قوم اور ملک کے لیے انتہائی خطرناک علامات ہیں۔ جب کسی قوم کے اندر لوگوں کا ووٹ پر سے اعتماد اُٹھ جاتا ہے اور آئینی طریقوں سے حکومت کے اندر تغیر و تبدّل سے وہ مایوس ہو جاتے ہیں، تو پھر وہ مُلک زیرِ زمین سرگرمیوں، سازشوں اور تشدد پسندانہ کارروائیوں کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔ چنانچہ دنیا کے کسی مُلک میں بھی جب انتخابات کے ذریعے تبدیلی کو بالجبر روکا گیا تو اُس ملک میں دہشت پسند تحریکات نے زور پکڑا جنھوں نے بالآخر قوم کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

ہم ملک کے وزیر اعظم سے پوری دلسوزی سے عرض کرتے ہیں کہ وہ براہِ کرم تاریخ سے سبق حاصل کریں اور منصفانہ انتخابات منعقد کرا کر ووٹ پر سے عوام کے متزلزل اعتماد کو پھر سے بحال کرنے کی کوشش کریں۔ آئینی ذرائع سے حکومت کرنے والے ہاتھوں کی تبدیلی میں ملک اور قوم کی بھلائی کے علاوہ خود اُن کی اپنی بھلائی کا راز بھی مضمر ہے۔ اگر خدانخواستہ عوام ووٹ کی قوت سے مایوس ہو کر تشدّد کی راہ پر چل نکلے تو اِس سے ملک و قوم بھی تباہ ہو جائیں گے اور خود حکمران بھی کسی خوفناک انجام سے دوچار ہوں گے۔

اقتدار کا کیا ہے، یہ تو آنی جانی چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی فرد، گروہ، خاندان یا قوم کو اقتدار کا مستقل طور پر پٹہ لکھ کر نہیں دیا ہے۔ اس بنا پر ایسی گریزپا شے کو ہمیشہ کے لیے اپنے قبضے

میں رکھنے کی کوشش محض خام خیالی ہے۔ جس طرح ہر ذی روح کو موت کا مزہ چکھنا ہے اسی طرح ہر صاحبِ اقتدار کو مسندِ اقتدار سے محروم ہونا ہی ہے — اس صورتِ حال کے پیشِ نظر کیا یہ طرزِ عمل دانشمندانہ نہیں کہ مقتدر جب یہ دیکھے کہ عوام اُسے مسندِ شاہی پہ براجمان نہیں دیکھنا چاہتے تو اُن کے اس فیصلے کو خوش دلی سے قبول کرتے ہوئے اس مسند سے خود بخود الگ ہو جائے اور اس وقت کا انتظار کرے جب عوام اس کے خلاء کو محسوس کرتے ہوئے اُسے عزت و احترام کے ساتھ تختِ اقتدار پہ دوبارہ فائز کرنے پہ اصرار کریں۔

(بقیہ روداد ابتلاء: احمد رائف مصری)

قاہرہ کی مختلف سڑکیں عبور کر گئے۔ میجر نے ڈرائیور کو حکم دیا کہ وہ ہمیں "اُوپر" لے چلے — یہی لفظ تھے۔

قلعہ کے بُرج نمودار ہوئے اور قریب ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ وہ میری نظروں میں یوں جھلکنے لگے جیسے کوئی دیو آسمان کو پینگ مار رہا ہو۔ نہ معلوم مجھے کیوں اس وقت یہ محسوس ہوا کہ حضرت عمرو بن العاص کی روح میرے سامنے جلوہ افروز ہے۔ اُس عظیم انسان کی رُوح جس نے مصر کو مشرق کی رومن سلطنت کے مظالم سے نجات دلائی تھی اور اُس عظیم انسان کی برکت سے میں آج مسلمان ہوں۔ اسی وقت مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ اسلام کی رُوح سنگین حالات اور کٹھن آزمائشوں کے باوجود قاہرہ کے درودیوار پہ چھائی رہے گی۔

گاڑی عجیب و غریب ٹیڑھی اور پیچدار سرنگوں کے اندر سے گزرتی رہی اور میں ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں اب کوئی عام شخص ادھر اُدھر چلتا نظر نہیں آرہا تھا - سرنگیں صرف سپاہیوں سے بھری ہوئی تھیں جنہوں نے رائفلیں اُٹھا رکھی تھیں اور ان کی نوکوں پہ چمکتی ہوئی سنگینیں آویزاں تھیں۔ انہوں نے سروں پہ آہنی خود اوڑھ رکھے تھے، گویا وہ کہیں جنگ کو جا رہے ہیں۔ ایک دروازے کے پاس ہم پہنچ کر گاڑی سے اُتر گئے - میں نے اندازہ لگایا کہ میرے ساتھیوں کا سلوک اب میرے ساتھ زیادہ سخت ہوتا جا رہا ہے —— ہم ایک ایسی جگہ داخل ہو گئے جیسے ہم کسی پُرانے محل کے اندر کسی قدیم قبر کے اندر داخل ہو رہے ہوں —— ہم دراصل قلعہ کی جیل کے دروازے پر تھے۔ اسی جیل نے ایسا خون آشام ڈرامہ دیکھا ہے جو عہد گذشتہ میں محمد علی پاشا کے خونی ڈراموں سے بھی زیادہ انسانیت سوز تھا —— مجھے یاد ہے کہ اس جیل میں میں نے اگلے ہی روز ایک انسان کی لاش اپنے کندھوں پر اُٹھائی تھی جو اس خون آشام ڈرامہ کی بھینٹ چڑھ گیا تھا —— اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

(باقی)